فیضؔ کا منفرد تنقیدی اُسلوب

سید ارتضا حسن*

ڈاکٹر صوفیہ یوسف**

Abstract:

Criticism is pride of literature and achieved its peak in the twentieth century. Faiz was no doubt a magnificent poet but it is a hard fact that his unique and non- traditional criticism was undermined under his popularity as a poet not only in his times but even today. His unique diction, style, balance and straightforward opinions are very rare and exceptional in the field of literary criticism. His firmness with his ideology that literature is a product of collective thoughts of the society is conceived from revolutionary ideas of Karl Marx. His reforms in the field of literature are an asset not only to unveil his own poetry but to understand the real philosophy and approach of progressive movement. However, his remarkable work was criticised by contemporary critics. In spite of all opposition his criticism is by and large free from partiality and misbalance. His thought provoking essays need to be explored to realise the importance of collective conscience of masses. In the present hours of turbulence and instability it is essential to reaffirm his ideology to make literature more beneficial for the common people.

جس طرح اَدب زندگی کو سمجھنے کا ذریعہ ہے بالکل اسی طرح تنقید اَدب کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ تنقید کا کام اَدب کی مائیت اور نوعیت جاننا ہے۔ یہ اَدب کی خوبیوں اور خامیوں کو شعور کے دائرے میں لے آتی ہے۔ کلام کے

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور سندھ۔
** صدر شعبہ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور سندھ۔

محاسن اور معائب پر روشنی ڈالنے کے علاوہ کلام کے مرتبہ کو جانچنے کی کوشش کرتی ہے۔ایک ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت زُبان، قواعد، علمِ بدیع، علمِ بیان اور علمِ عروض پر دسترس رکھتا ہو۔اِس بنیادی شرط کے علاوہ فلسفہ، عمرانیات، تاریخ اور تصوف جیسے علوم تنقید میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تنقید کا علم ایک مربوط علم ہے اور کسی بھی فن پارے کے حوالے سے ایک ناقد کی رائے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔یہ قاری اور تخلیق کار کے علم میں وسعت پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی اِس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تنقید عمومی اور سرسری اظہارِ رائے نہیں ہے۔غیر قطعی اور گول مول بات کہنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔تنقید کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے۔''(۱)

بیسویں صدی میں اَدب کے حوالے سے بہت کام ہوا ہے۔اِس کی تمام اَصناف میں تخلیق کاروں کی دماغ آرائیاں اور دل سوزیاں منظرِ عام پر آئی ہیں لیکن جہاں تک تنقید کے شعبے کا تعلق ہے تو اس میں غیر معمولی بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔موجودہ دور میں تنقید کی افادیت اور زیادہ منظّم اور موثر علم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔احتشام حسین کہتے ہیں:

> ''موجودہ دور میں جس صنفِ اَدب نے سب سے زیادہ پیش رفت کی ہے وہ تنقید ہے۔''(۲)

جہاں تک مغربی تنقید کا تعلق ہے وہاں بھی موجودہ دور میں پیش رفت کے حوالے سے مثبت اشارے ملتے ہیں۔جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''شاید کسی صدی میں تنقید کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور اتنے نظریات پیدا نہیں ہوئے جتنے بیسویں صدی میں آتے ہیں۔اس وقت سارے مغرب میں متعدد نقاد اس فن سے وابستہ ہیں۔''

مگر اس سے زیادہ غور طلب وہ بات ہے جو وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''ان میں بہت سے ایسے ہیں جو مخصوص نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو جدید ذہن کے ساتھ ادب و فن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔''(۳)

اُردو اَدب میں تنقید کی روایت مغربی تنقید کی مرہونِ منت ہے۔مغرب میں تنقید کی کا سلسلہ ارسطو سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔پنڈار اور جورجس سمیت متعدد شعراء تنقیدی شعور کے حامل تھے:

> ''ارسطو سے سینکڑوں سال پہلے اس علم کے نشانات قائم ہو چکے تھے۔ھومر کے ہاں ۔۔ جو دنیا کا پہلا معلوم شاعر ہے، عظیم شاعرانہ قوتوں کے ساتھ ساتھ گہرے تنقیدی

شعور کا حساس ہوتا ہے۔ھومر کے معاصرین اور اس کے بعد آنے والے شعراء مثلاً
ھیسڈ، زنوفینز، پنڈار اور جورجس کے کلام میں اہم تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔"(۴)

اس تحریر سے جہاں ہمیں اَدب میں تنقیدی شعور کی ابتدا کے بارے میں معلومات ملتی ہیں وہاں یہ سُراغ بھی ملتا ہے کہ بنیادی طور پر شعراء ہی اِس علم کے خالق ٹھہرائے گئے ہیں کیونکہ تنقید اور تخلیق ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔تنقید کے عمل کو تخلیق سے کسی صورت علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جستجو اور تلاش نے اِسے سائنس کے ہم پلہ کر دیا ہے:

"نقاد کا اصل کام تو یہ ہے کہ وہ مصنف اور اس کی تخلیق کو پھر سے تخلیق کرے۔اسی لیے
نقاد میں شاعر کی صفات بھی ہونی چاہییں اور سائنس دان کی بھی۔تنقید، تخلیق و تلاش
میں سائنس کی طرح ہے اور تخلیق میں شاعری کی طرح۔"(۵)

علم واَدب سے وابستہ افراد بھی اس میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔مسلسل مطالعہ اور مشاہدہ ایک اُستاد میں بھی یہ صفات پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اَدب کی ماہیت اور نوعیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دے سکے۔ایف آر۔لیوس کہتے ہیں کہ گہری فکر، علم اور مطالعے کی مدد سے درست فیصلوں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے:

"ایک فاضل معلم بھی گہرے علم، فکر اور مطالعہ کے ذریعے ایک نقاد کے فرائض انجام
دے سکتا ہے۔وہ اپنے علم کے ذریعے اور جنیکل فیصلوں تک پہنچتے ہیں۔"(۶)

اَدب کا مطالعہ بھی انسان میں وسعت پیدا کرتا ہے۔کسی بھی تحریر سے متعلق قاری کی رائے بھی بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔بنیادی طور پر نقاد بھی ایک قاری ہوتا ہے جو کسی فن پارے کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کر دیتا ہے۔چنانچہ جمیل جالبی اپنے مطالعے کی روشنی میں لکھتے ہیں:

"ھنری جیمس نقاد کو محض ایک قاری کہتا ہے۔ایک ایسا قاری جو اپنے تاثرات رقم کر
دیتا ہے"(۷)

تنقیدی روایات اور تنقیدی تاریخ کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ناقدین کے علاوہ بہت سے شعراء نے تنقید کے میدان میں قابلِ ذکر کام کیا اور اِس علم میں جدتِ افکار سے نئی حرارت و توانائی پیدا کی۔اس ضمن میں بہت سے نامور شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔اُردو ادب کے حوالے سے ناصرؔ کاظمی اور فیضؔ کے علاوہ میرا جی، فراق اور سجاد ظہیر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔جہاں تک مغربی تنقید کا تعلق ہے تو یہ روایت زیادہ مستحکم نظر آتی ہے۔ایلیٹ، کولرج، وڈز ورتھ سبھی شاعروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے:

"ایلیٹ شاعر پہلے ہے اور تنقید کو اپنی شاعری کے کارخانے کی ذیلی پیداوار کہتا ہے۔
وہ وڈز ورتھ اور کولرج کی طرح ایک نئی شاعری کا موجد ہے اور اس کی تنقید اس کے
انکشافات اور وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن اس کی ذیلی پیداوار میں وہ سب

کچھ ہے جسے ہم کسی بڑے نقاد کی تحریروں میں تلاش کرتے ہیں''(۸)

اس میں شک نہیں کہ شاعروں کی اِس تخلیقی تنقید نے اِس شعبے میں جمود کو توڑا ہے اور نصابی تنقید سے چھٹکارا دِلوانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عام قاری کو تنقید کی بھاری بھرکم اصطلاحات سے بچا کر سہل اور آسان انداز میں اَدب کے قریب لانے کی مخلصانہ کوشش بھی کی ہے۔ جمیل جالبی نصابی تنقید کے حوالے سے ایلیٹ کے مضامین کا مقدمہ لکھتے ہوئے زور دیتے ہیں کہ اَدب میں نئی فکر، مختلف سوچ اور انوکھے زاویوں کی بہت ضرورت ہے ورنہ اَدب کا طالبِ علم فقط نصابی نقادوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اس قسم کی تنقید کے مضراثرات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اس تنقید کا ایک زہریلہ اثر تو یہ ہوا کہ آج کا طالبِ علم اور قاری کسی اوریجنل تصنیف کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔ اسے ادب پاروں سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ نصابی نقادوں کی رائیں ادب پاروں کا بدل بن گئی ہیں اس زہریلے اثر نے سوچنے کی صلاحیت کو مُردہ کر دیا ہے اور ادب پاروں کے ساتھ ذہنی سفر کو ایک بے معنی چیز بنا دیا ہے۔ نصابی نقادوں کی آراء کی بیساکھیاں نوجوانوں کے پاس ہیں اور ادبی فیصلوں کے کیپسول ان کے ذہن کے خانوں میں رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی ساری ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ جعلی دستاویزیں نقلی مہروں کے ساتھ اصل کی جگہ لے رہی ہیں۔''(۹)

تاہم اِن آراء کی روشنی میں کسی باقاعدہ نقاد کی اہمیت سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کا ایک مخصوص زاویہ نظر بن جاتا ہے جس کے باعث اس کا تنقیدی شعور محدود ہو جاتا ہے اور اس کی نظر معروضی نہیں رہتی۔ موجودہ دور میں ایک نقاد کے سامنے نہ صرف وہ شاعر ہوتا ہے بلکہ اِس کی اپنی زبان اور دیگر زبانوں کے شاعر و ادیب بھی ہوتے ہیں جن کا مطالعہ ایک الگ ریاضت اور دل جمی کا متقاضی ہے۔ گویا تنقید کا میدان اب خصوصی ماہرینِ فن کا طلب گار ہے۔ جمیل جالبی نے اس سلسلے میں پروفیسر لیوس کی رائے یوں پیش کی ہے:

> ''لیوس نے کہا کہ شاعر کا تنقیدی شعور محدود ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق کے حصار میں محصور ہوتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے اس میں صرف وہ پہلو نمایاں ہوتا ہے جو خود اس کے فن پر پورا اُترتا ہے''(۱۰)

اِن سب آراء کی روشنی میں اب ہم فیضؔ کے منفرد اُسلوب کا جائزہ لیتے ہیں:

عام قارئین کی نظر میں ادب کی زیرِ بحث شاخ یعنی تنقید، شاعری اور نثر کے مقابلہ میں غیر دلچسپ اور خشک اُسلوب کی مالک ہے۔ مگر فیضؔ سمیت دیگر غیر روایتی ناقدین نے اِس تاثر کو کافی حد تک بدلنے کی کوشش

کی۔فیضؔ کی تنقید کئی اعتبار سے اہم ہے۔فیضؔ نے ادبی مسائل اور نظریات کو اِس خوبصورتی سے سپردِ قلم کیا ہے کہ اس ساری کاوش میں ایک عام پڑھنے والے کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا ہو گیا ہے۔فیضؔ کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''میزان'' مندرجہ ذیل موضوعات کا احاطہ کرتی ہے:

☆نظریہ ☆مسائل ☆متقدمین ☆معاصرین

اس کے علاوہ شعری مجموعوں کے دیباچے اور ایسے مضامین جو آپ نے دورۂ انگلستان اور یورپ کے دوران روزناموں اور ہفت روزوں کے لیے رقم کیے، فیضؔ کا چھوڑا ہوا تنقیدی سرمایا ہیں۔تاہم تنقید سے متعلق ان کی مستند ترین اور قابلِ ذکر کوشش میزان ہی ہے۔ترقی پسند تحریک کے ناقد ترقی پسند تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے فیضؔ کی ''میزان'' کے مواد سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پھر کتابوں کے مقدمے ہیں یا وہ مضامین ہیں جو رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اِن میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیضؔ کے مضامین اچھے اور دلچسپ ہیں۔'' (۱۱)

اوّل تو یہ کہ اِن کی اپنی رائے کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام قارئین کے لئے تنقید کو سمجھنے کے بہتر امکانات پیدا ہو گئے ہیں ۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کی تنقید خود ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ممد و معاون ہے۔بنیادی طور پر فیضؔ ایک نظریاتی شاعر ہے۔اس کی شاعری کو سمجھنے سے پہلے اس کے نظریے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔فیضؔ کی تنقید نے فیضؔ کی شاعری میں امکانات کے نئے نئے راستے کھول دیے ہیں۔آج کا نقاد اور قاری کلامِ فیضؔ کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی تنقید کو پس منظر میں رکھتا ہے۔''میزان'' کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے ایک ناقد لکھتے ہیں:

> ''فیضؔ نے اپنی تمام تر شاعری کا محور، انہیں اُصولوں اور نظریات کو بنایا ہے اور اُن کی شاعری کو اِسی محور کے گرد و پیش دیکھنا چاہیے۔'' (۱۲)

ہر چند کہ یہ شاعر کی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کا اعلان کرتا پھرے یا اپنے جمالیاتی ذوق اور نظریۂ حیات کی بابت وضاحتیں پیش کرے مگر مغرب کی ادبی روایت کی طرح اب مشرق میں بھی یہ روایت پنپ رہی ہے کہ شاعر اپنے ادبی عقائد کی تحریک پر روشنی ڈالے۔ ایلیٹ، کولرج اور گوئٹے سمت دیگر مغربی شعراء نے اپنے نظریات کی واضح تشریحات اپنے تنقیدی مضامین میں پیش کی۔جس سے ان کے نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کو سمجھنے میں سہولت ہوئی:

> ''ضروری تو نہیں کہ شاعر اپنے نظریۂ شاعری کا اعلان کر کے شاعری کرے مگر اُس کی شاعری میں اور عام شاعری کے لئے بھی بالفعل، شاعری کا اپنا ایک روّیہ اور ایک نقطۂ

نظر ضرور ہوتا ہے کہ وہ زندگی کیسی چاہتا ہے، سماج اور اپنے گرد و پیش کے حالات کو کس طرح کا مانتا ہے۔ یا شاعری جمالیات سے لے کر، زندگی کے نشیب وفراز، انسانوں کی پرورش اور ان کے کیف وکم کے لئے کون سا نظریۂ حیات اور فکری جذباتی زاویۂ نظر اپنانا پسند کرتا ہے۔ یہ صورت شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ہمیشہ رہی ہے، مغرب میں بھی اور مشرق میں بھی۔''(۱۳)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس تنقید سے فیضؔ اُس مسند پر بھی فائز ہو گئے ہیں جس کے تحت یہ بھی ایک نقاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اہلِ سخن کے لیے مستقبل کی راہیں ہموار کرے۔ وقت اور حالات میں تبدیلی کے باعث ادبی معیارات میں نمایاں ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی کرے اور تخلیق کے نئے نئے امکانات کی پیش بینی کرے۔ فیضؔ کی روشن خیالی نے اس اُمید کو زندہ رکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے اشفاق سلیم مرزا کی رائے غور طلب ہے:

''تنقید کا ایک بنیادی کام تخلیق کے لئے راہ ہموار کرنا بھی ہے۔ فیضؔ ایک روشن خیال ناقد اور مثبت طرزِ فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ شاعر کو بھی معاشرے کا فرد سمجھتے ہیں۔ ان کی مطابق جس طرح معاشرے میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے اسی طرح اظہار میں تبدیلی بھی ایک ناگزیر عمل ہے۔ جیسے جیسے معاشرے میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اسی انداز سے اظہار کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ پرانی اصناف کی ہیئت میں تبدیلی یا نئی اصناف کے معرضِ وجود میں آنے کے حوالے سے وہ انتہائی پُر اُمید ہیں۔''(۱۴)

یہ درست ہے کہ نئی اصناف کو خوش آمدید کہنے کے بارے میں فیضؔ کا رویہ بہت صحت مندانہ ہے اور ان کی تنقید نئی جہت پر استوار ہے لیکن فیضؔ کو ایک شاعر کی حیثیت سے جو پذیرائی نصیب ہوئی وہ پذیرائی ایک نقاد کی حیثیت سے اُن کا مقدر نہ بن سکی۔ اُردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے یہ بات اتنی ناقابلِ فہم بھی نہیں۔ مرزا غالبؔ کو (ان کے خطوط کی روشنی میں) ایک عرصہ بعد نثر نگار مانا گیا۔ نظیرؔ اکبر آبادی کو مدتوں شاعر ہی تسلیم نہ کیا گیا اور آج تک اِن کی غزل گوئی ان کی نظم گوئی کے پیچھے دبی ہوئی ہے۔ میرا جی کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اِن کی ناقدانہ شخصیت ابھی تک تعارف کی محتاج ہے۔ مسدّس اور مقدمہ نے حالیؔ کے دیگر کلام کو چُھپا رکھا ہے۔ اِسی طرح فیضؔ کو بحیثیت شاعر اتنی توجہ ملی کہ اِن کا ناقد ہونا لوگوں کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ علاوہ ازیں فیضؔ نے اپنی تنقید کا تعارف بھی اس کسرِ نفسی سے پیش کیا ہے کہ دیگر ناقدین کو اس سے صرفِ نظر کرنے کا بہانا ہاتھ آ گیا ہے۔

''ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کے لیے نہ کبھی فرصت میسر تھی، نہ دماغ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ان مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع البتہ ملتے رہے، یہ

مضامین ان ہی باتوں کا مجموعہ ہیں اس لئے ان میں سخن علماء سے نہیں۔عام پڑھنے والوں سے ہے جوادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں،ان میں سے بیشتر اب سے پچس برس پہلے جوانی میں لکھے گئے تھے۔''(۱۵)

فیضؔ کا تنقیدی اُسلوب ہر اعتبار سے منفرد اور یگانہ ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے زاویۂ نظر نے وسیع تجربے اور مطالعے سے فروغ پایا ہے۔قوموں کے خدوخال اور عروج وزوال کے اسباب پر گہری نظر نے ان کی تنقید کو علمی وسعت کا حامل بنا کر ہمہ گیر کر دیا ہے۔اِن کا فکری اُسلوب منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے جس سے اِس کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔فیضؔ کی تنقید کا مطالعہ ہمیں ادب فہمی کی اُس روایت کا پاسدار بنا دیتا ہے جس کی بنیاد مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی اصلاحی تحریک کے تحت اُٹھائی تھی۔ادب میں ارتقاء سماجی عمل کا حصہ ہے جو تہذیبوں کے تصادم کی پیداوار ہے۔اس کے اَن مٹ نقوش کا سبب یہ ہے کہ ادب کی جڑیں معاشرے میں پیوست رہتی ہیں اور کسی نہ کسی صورت نمو پاتی رہتی ہیں۔اس پُر پیچ عمل کو فیضؔ نے ایک پُر تاثر اُسلوب کے ساتھ اپنے قاری تک پہنچایا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ فیضؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان' اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے مولانا حالؔی کی مقدمہ شعروشاعری کی طرح ایک اہم دستاویز ہے۔فیضؔ نے بہت سادہ دھیمے لیکن سلگتے ہوئے اُسلوب کے ساتھ اپنے قاری کو یہ بات پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ حُسن یا جمالیات اور فنونِ لطیفہ کی تمام قدریں بنیادی طور پر معاشرے سے پیوست ہوتی ہیں۔اس حوالے سے اگر ہم تاریخ کے عمل کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں مختلف معاشروں اور قوموں کے گوں ناگوں تصادمات نے آخر کار ثقافت،فن کی دنیا میں کسی نا کسی خوبصورت امتزاج کو جنم دیا ہے۔''(۱۶)

فیضؔ کی شخصیت ایک مستند شاعر کی حیثیت سے مسلمہ ہے مگر اس شہرت کا حامل ہوتے ہوئے بھی اِن کا تنقید کے میدان میں اُترنا اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے بعض احساسات کی ترجمانی کے لیے تنقید ہی کو موثر ترین وسیلہ سمجھتے تھے۔اِن کے تنقیدی اُسلوب کے حوالے سے یہ بات انہایت اہم ہے کہ یہ اُسلوب ان کے شاعرانہ اُسلوب سے یکسر مختلف ہے۔سحر انصاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''دراصل یہ مضامین ایک ذمہ دار اور سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جس میں ادب،معاشرے اور زندگی کے بہت سارے مسائل اُبھرتے ہیں۔جس کا منصب، شعر گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور وفکر کرنا بھی ہے اور شاعر کے کلام سے نثر غالباً اسی صورت میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ فرما ہوتی ہے

جب وہ اپنے بعض خیالات کو نظم میں من وعن پیش کرنے میں نا کام رہتا ہے۔''(۱۷)

فیضؔ کے تنقیدی اُسلوب کو ایک براہِ راست اُسلوب قرار دیا جا سکتا ہے جو کسی غیر ضروری تمہید سے مبرا اور بے نیاز ہے۔ کسی تمہید اور تعارف کے بغیر مدعا بیانی اس مہارت کی متقاضی ہوتی ہے کہ ابتدا میں ہی ایسا جملہ تشکیل دیا جائے جو فوراً ہی قاری پر اپنی گرفت مضبوط کر لے اور یوں دامن گیر ہو جائے کہ اس بحث سے خارج ہونا اس کے بس میں نہ رہے:

''مضمون خواہ کسی موضوع پر ہو فیضؔ اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفسِ موضوع شروع ہی سے آپ کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے اور آپ ہمہ تن توجہ بن کر اس بحث میں شریک ہو جاتے ہیں۔''(۱۸)

جب گفتگو عوام سے ہو اور اجتماعیت کا شعور بیدار کرنے کا مرحلہ درپیش ہو تو اُسلوب میں مجلسی رنگ پیدا کرنا ایک اہم ضرورت بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ فیضؔ کی تنقید کے پس منظر میں ایک ایسے معاشرے کی جستجو بھی کارفرما ہے جو تعمیر کے جذبے سے سرشار ہے۔ لہٰذا ایک توانا اُسلوب جو جمہور کی ترجمانی کر سکے اور اس کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا عکاس بھی ہو فیضؔ کی ضرورت تھا۔ فیضؔ کے اُسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے صلاح الدین حیدر کہتے ہیں:

''فیضؔ کے اِن مضامین کا اُسلوب مجلسی اور جمہوری ہے، دوم وہ تہذیبی و ثقافتی اداروں کی معرفت معاشرے کی تفہیم اور تعمیرِ نو کے پروگرام کے متلاشی ہیں۔''(۱۹)

اپنے تنقیدی عقائد کو موثر الفاظ میں ڈھالنے کی ریاضت نے فیضؔ کی تنقید کو مربوط اور منظّم انداز سے آگے بڑھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اپنے تجربے اور فکری اساس کے بل پر وہ دوٹوک موقف اختیار کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کی تنقید بے نتیجہ ہونے کی بجائے کسی منطقی نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُردو تاریخ سے واقفیت نے ان میں اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ ادبی معیار کو پروان چڑھایا۔ اس کی روشنی میں وہ ادب پاروں سے متعلق رائے دیتے ہیں جس میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ جوشؔ کے شاعرِ انقلاب نہ ہونے سے متعلق اُن کی بحث اور موقف واضح اور غیر مبہم ہے۔ اس حوالے سے مظہر امام کی رائے بہت معانی خیز ہے:

''جہاں تک مجھے علم ہے، اُس وقت تک، کلیم الدین کے علاوہ کسی اور معتبر نقاد نے جوشؔ کی اس کمزوری کی بابت دوٹوک انداز میں فیصلہ نہیں دیا تھا۔''(۲۰)

فیضؔ نے اپنے ادبی ذوق کو مسلسل اور لگاتار ذہنی ریاضت سے پروان چڑھایا۔ اُن کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے مارکسی نظریات کو بھی بہت سوچ سمجھ کے اور چھان پھٹک کے بعد قبول کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ من وعن قبول کرنے کی بجائے اپنے ذہن اور جمالیاتی شعور کی روشنی میں شاعری کے حُسن کو

پامال کئے بغیر اپنی راہ خود نکالی اور یہی فیضؔ کی سب سے بڑی کامیابی بھی ہے۔اس درجہ ریاضت کے بعد ان کے نظریات غیر متزلزل اور شک و گنجائش سے پاک ہو گئے:

''فیضؔ کی شخصیت کا سب سے قابلِ لحاظ پہلو یہ ہے کہ فیضؔ نے زندگی کے کسی حصے میں اپنی آئیڈیالوجی میں تبدیلی نہیں کی۔''**(۲۱)**

ہر تخلیق ایک نئے تجربے کا اظہار ہوتی ہے۔اس کو پرکھنے کے لیے باصلاحیت نقاد کا ہونا غیر اہم نہیں۔جن تجربات سے گزر کر کسی فنکار نے تخلیق کی منزل کو سر کیا ان کا شعور حاصل کرنا ایک نقاد کے لیے لازم ہے۔فیضؔ خود شاعر ہونے کے ناطے تخلیق کی اہمیت سے آشنا تھے۔اُردو شاعری کی روایات اور اس کے مختلف دبستانوں کی سیاحت کرنے کے باعث وہ مختلف تخلیقی تجربوں میں امتیاز کرنے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔جمیل جالبی مغربی نقاد رچرڈس کے حوالے سے ایک اچھے نقاد کی جو خوبیاں بیان کرتے ہیں وہ سب فیضؔ میں بدرجہ اُتم نظر آتی ہیں:

''رچرڈس ایک اچھے نقاد کی تین خوبیاں بتاتا ہے۔ایک یہ کہ اس میں کسی مخصوص تجربے تک پہنچنے کی صلاحیت ہو اور اس صلاحیت کو اس نے مشق سے سنوار لیا ہو۔دوسرے یہ کہ اس میں مختلف تجربات کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہو۔تیسرے یہ کہ نقاد کے پاس مستقل فیصلہ کُن اقدار ہوں جن کے حوالے سے وہ کسی نظم کے تجربے کو بیان کر سکے۔''**(۲۲)**

چناں چہ حالیؔ کے شاعرانہ اُوصاف کا حوالہ دیتے ہوئے فیضؔ نئے نئے انکشافات کرتے ہوئے واضع اور سنجیدہ موقف اختیار کرتے ہیں:

''حالیؔ فطرتاً واعظ نہیں شاعر تھے۔ان کی طبیعت میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔قوم کی ذلت کے احساس اور وطن کی جدائی نے ان جذبات کو اور بھی تیز کر دیا تھا جب وہ ان سے ہٹ کر اخلاقی اور اصلاحی شاعری کرنا چاہتے تھے تو انہیں طبیعت پر جبر کرنا پڑتا تھا۔''**(۲۳)**

ہر چند کہ جمہور اور ادب کا تعلق مغربی حوالوں سے کافی مقبولیت اختیار کر چکا تھا مگر اس کے باوجود فیضؔ کو یہ شکایت رہی کہ زندگی کے حقیقی رشتوں میں ترقی پسند ادب کی جڑیں مضبوط ہونے کا سلسلہ سُست روی کا شکار کیوں ہے؟ وہ اس حوالے سے اعتراز کرتے ہیں:

''آجکل ادب اور عوام کے متعلق کچھ اس لہجے میں گفتگو کہ جاتی ہے گویا عوام کا ادب ابھی ابھی ہم نے ایجاد کیا ہے اور بیسویں صدی سے پہلے نہ عوام کو ادب سے پہلے کوئی دلچسپی تھی نہ ادب کو عوام سے۔''**(۲۴)**

فیضؔ نے جمہور اور ادب کے اس رشتے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی اور شاعری کے مستقبل کو اسی رشتے سے وابستہ کرنے کی جِد وجہد کی۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے مختلف ادبی اصلاحات کی از سرِ نو تعریف کی۔۔ فیضؔ کے نزدیک الفاظ کی اصطلاحی اہمت وقت کے ساتھ ساتھ زائل ہوگئی ہے۔ اپنے مضمون ''ہماری تنقیدی ااصطلاحات''میں انہوں نے روایتی اصطلاحات میں موجود ابہام کی وضاحت کی کیونکہ وہ اس کو زبان کا عجز تصور نہیں کرتے:

> ''ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسبِ ضرورت تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتیں یہ زبان کے عجز یہ طعن نہیں ہے۔''(۲۵)

ان کی رائے میں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سماج سے الفاظ کی عدم وابستگی کے باعث ان کے معانی افلاس کا شکار ہوگئے ہیں۔ جس قدر زبان کو عوام میں پذیرائی ملے گئی اُسی قدر اس زبان کے الفاظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوگی۔ ترقی پسند ادب کے علاوہ کسی اور نے ادب اور جمہور کے رشتے کو نہیں سمجھا لہٰذا وہ ادب کے بہتر مستقبل کے لیے ادب کو عوام کے قریب تر لانا چاہتے ہیں۔ فیضؔ کے نزدیک ادب کے ترقی پسندانہ رویے ہمیں اجتماعیت اور افادیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ وہ اس نقطہ کی وضاحت بھی سہل انداز میں کرتے ہیں کیونکہ جمہور میں ایک اجتماعی شعور اُجاگر کرنے کے لیے بیان کے وہ انداز کارگر ہو سکتے ہیں جن کی اساس روز مرہ کے واقعات اور تجربات ہوں گے۔ اس مخصوص فکر کو فیضؔ نے اپنے رگ و پے میں اُتار لیا تھا:

> ''ایک مشینی انداز گفتگو کے بجائے ان کی تحریر اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہِ راست الفاظ ہوتے ہیں جن میں زندگی، حرارت اور توانائی اور روز مرّہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوتا جاتا ہے کہ ایک نظریہ اور ایک مخصوص فکر کو اُنھوں نے اپنی ذات میں تحلیل کر لیا ہے۔''(۲۶)

ترقی پسند نظریات کی ترویج کے حوالے سے فیضؔ کا نام اپنے وقت کے جیّد ترقی پسند اکابرین کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ اِن ناقدین نے مارکسی نظریات کو اُردو ادب میں متعارف کروانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اِن کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نظریے کی ترویج کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس نظریے سے وابستہ مسائل پر بھی بحث کی اور ان کا حل بھی پیش کیا۔ فیضؔ کا نام بھی آج انہیں ترقی پسند ناقدین کے ساتھ لیا جاتا ہے جو زبان و ادب کے فروغ میں پیش پیش رہے:

> ''ترقی پسند تحریک کی پہلی صف میں ان ناقدین کا شمار کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے اُردو میں اس تحریک کی خشتِ اوّل رکھنے کا کام کیا، اور نئے تنقیدی مباحث کا آغاز کر کے

زبان وادب اور فکر ونظر کو وسعت دی ان میں سب سے اہم نام اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور فیض احمد فیضؔ کے ہیں۔ان ناقدین نے ترقی پسندی کے مفہوم کو متعین کرنے اور ترقی پسند ادب وتنقید کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔''(۲۷)

فیضؔ نے ترقی پسند نظریات کی روشنی میں اِس بات پر زور دیا کہ فنونِ لطیفہ اور حُسن و جمالیات کی جڑیں معاشرے سے ہی پھوٹتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ادب کا جمہور کے ساتھ رابطہ ہر دور میں قائم رہا ہے۔فیضؔ کے مطابق تمام فنونِ لطیفہ جمہور کے باطن کی تہذیبی زندگی کا ردِعمل پیش کرتے ہیں۔تنقید میں اُنھوں نے اَدب کے ترقی پسند نظریاتی مسائل کو چھیڑا ہے اور ادب کو دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح ثقافت یا کلچر کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔اِن کی رائے میں عمرانی حقائق کا بیان نہ صرف اَدب میں افادیت کا پیش خیمہ ہے بلکہ ادب میں جمالیات بھی انہیں حقیقتوں کا ثمر ہوا کرتی ہے۔عوام اور ان کے مسائل سے وابستہ موضوعات اِن کے محبوب ترین موضوعات ہیں:

''فیضؔ کے نزدیک جمالیاتی قدر کی 'سماجیت' مسلّم ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے زمانے کی سماجی اور عمرانی حقیقتوں کا اظہار ادب کی افادیت کو ہی نہیں، اُس کی جمالیاتی قدر و قیمت کو بھی فزوں کرتا ہے اور اسی لیے وہ امن، آزادی، حب الوطنی، سلطانئ جمہور وغیرہ کو اپنے وقت کے اہم موضوعات قرار دیتے ہیں۔''(۲۸)

فرد سماج کی پیداوار ہے اور اس کی سماجی زندگی کا کوئی گوشہ بھی نظر انداز کرنے سے اس کے فن کی درست تشریح ممکن نہیں۔لہٰذا طبقاتی بنیاد رکھنے والے معاشرے اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کسی بھی تخلیقی عمل میں اہم ہوتے ہیں۔محض فنکار کے ذاتی جذبات کوئی وقعت نہیں رکھتے بلکہ ماحول سے متعلق اس کا ادراک اور شعور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔کیونکہ فنکار کی اپنی شخصیت بھی تہہ دار ہوتی ہے لہٰذا تخلیقی عمل کو جذبات اور تخیل میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔یہی مارکسی نظریات کی اساس ہے۔قمر رئیس مارکس اور اینگلز کا نقطہ نظر یوں واضح کرتے ہیں کہ وہ تخلیقی عمل کو ایک وحدت خیال کرتے ہیں:

''فنکارانہ یا تخلیقی عمل کو وہ ایک وحدت تصور کرتے ہیں اور اسے تخیل یا جذبہ وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔''(۲۹)

یوں ترقی پسند تنقید اَدب کے جمالیاتی اثرات سے پہلو تہی نہیں کرتی اور میکانکی یا سطحی ہونے سے بچ جاتی ہے۔بصورتِ دیگر کسی بھی فن پارے کی حیثیت ایک سماجی دستاویز سے زیادہ نہیں رہتی۔اس کے ساتھ ساتھ فیضؔ ترقی پسند نقاد ہونے کے ناطے ترقی پسند تحریر میں ادبی معیار کو بھی بلندی پر دیکھنا چاہتے ہیں:

''ان کا کہنا ہے کہ ترقی پسند تحریر وہ ہے جو سماجی ترقی میں مدد دے اور ادب کے فنی معیار پر پوری اُترے۔'' **(۳۰)**

اِدھر ترقی پسند نظریات کی ترویج فیضؔ کا مشن ٹھہرا اور اُدھر ان کی نفی اور تردید اس کے مخالفین کا وطیرہ۔مخالفت برائے مخالفت کی اس فضا میں میں فیضؔ نے اُمید کا چراغ جلائے رکھا اور مثبت رویوں کے ساتھ اپنے نظریات کی آبیاری میں ہی عافیت جانی۔عام قاری سے اس کی اجنبیت دور کرنے اور اپنے مخالفین کو للکارنے کی بجائے تحقیق اور انصاف کا نعرہ لگا کر ترقی پسند ادب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی:

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ہوا سے لڑنے کی بجائے تحقیق اور انصاف سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے۔نہ اس نظریے میں کوئی ایسی انوکھی بات ہے جس سے جہاد کرنا مذہبی فریضہ تصور کیا جائے۔'' **(۳۱)**

ترقی پسند تہذیب نے ابتدا ہی سے اُردو ادب اور اس کے پرستاروں کو بے پناہ متاثر کیا۔اِس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ اِس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اِس کے نظریات لوگوں کے لئے کسی نئے ادبی مسلک کو منکشف کرنے پر آمادہ ہیں۔روایاتِ کہن کو مٹا دینے کے ساتھ ساتھ شدت پسندی اور جذباتیت کی فضا کو فروغ دینے میں ترقی پسند تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس تحریک پر محض پروپیگنڈہ ہونے کا الزام ثبت کر دیا جاتا:

''اب سے ٹھیک پچاس سال قبل اُردو میں مارکسی تنقید کے جو نمونے سامنے آئے ان میں بھی شدت پسندی کا یہ انداز غالب تھا۔اس نے لوگوں کو اس طرح چونکایا جس طرح کوئی بھی نیا تنقیدی مسلک ابتداء میں اپنی اجنبیت، شدت اور بُت شکنی سے چونکاتا ہے۔'' **(۳۲)**

اس صورتِ حال میں فیضؔ کی استدلالی تنقید نے اس تحریک کی راہ کافی حد تک ہموار کی۔ایک نقاد کا بنیادی کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تخلیق کی راہوں میں شعور کی شمعیں روشن کرتا رہے اور یہی کام فیضؔ نے کیا۔ان کے تنقیدی نظریات نے اَدب میں عدم توازن کی روش کو ختم کرنے کی سعی کی۔اِن کے نزدیک ہماری تنقید کو اپنا دائرہ محض ادب پارے کی فنی اور معنوی خوبیوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس تخلیق کے پس منظر میں چُھپے سماجی محرکات کا شعور اور ادراک حاصل کرنا بھی ہونا چاہیے۔اس طرح فیضؔ نے تخلیق کو اس کے ماحول میں پرکھنے کا اشارہ دے کر تنقید نگاروں کو ایک نیا زاویہ نظر عطا کیا۔شارب ردولوی نے فیضؔ کی اس متوازن فکر کی وضاحت اس طور کی ہے:

''فیض کے تنقیدی نظریے میں توازن اور اعتدال ہے۔انھوں نے ترقی پسندی و رجعت پرستی اور اپنے عہد کے دوسرے ادبی و تنقیدی مباحث پر اظہارِ خیال کیا۔وہ

بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ان کی تنقیدوں میں کسی طرح کی جذباتیت یا انتہا پسندی نہیں ملتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ہماری تنقید کو تشبیہوں یا استعاروں کی ندرت یا مضامین اور خیالات کی جدت پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ تخلیق کے سماجی پس منظر کا تجزیہ کر کے ہر ادیب کو اس کے ماحول کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہئے۔''(۳۳)

میراجی مختلف مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔حلقۂ اربابِ ذوق کے فعال رُکن ہونے کی حیثیت سے ان کی آئیڈیالوجی اور فیضؔ کی آئیڈیولوجی میں خلیج حائل رہی۔اِس سارے سلسلے کے دوران فیضؔ نے اعتدال اور توازن کا دامن تھامے رکھا اور کسی مرحلہ پر جانب دارانہ رائے دینے میں احتیاط برتی۔میراجی کے حوالے سے ان کی تنقید توازن اور اعتدال کی علم بردار ہے اور اِن کی آراء اس حوالے سے اہم ہیں کہ اِن میں فیضؔ نے تعصب سے بالاتر ہو کر میراجی کے مقام اور مرتبے کی بے کم وکاست وضاحت کی ہے۔اپنے تنقیدی مضمون ''میراجی کا فن'' کا آغاز وہ انتہائی نپے تُلے انداز سے کرتے ہیں:

''میراجی کے مضامین کی تالیف واشاعت کئی اعتبار سے اہم اور ادبی واردات ہے۔ یوں تو ابھی میراجی کی منظومات کا شیرازہ بکھرا پڑا ہے اور ان کے کلام کا کوئی تسلّی بخش مجموعہ ابھی تک مدّون نہیں ہوا۔ان کی زندگی میں جو متعدد مجموعے طبع ہوئے وہ بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے لیکن دنیائے شعر میں میراجی کا نام اتنا معروف ہے کہ ایک حد تک اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔''(۳۴)

فیضؔ کے بیشتر تنقیدی مضامین اپنی طوالت کے لحاظ سے بھی توازن اور اعتدال کی عمدہ مثال ہیں۔ جہاں آج کل طویل مضامین اپنی جاذبیت اور افادیت کھو دیتے ہیں اور حد سے زیادہ مختصر بیانی بھی تحریر کا ایک عجز تصور کی جاتی ہے وہاں فیضؔ کی تنقید اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں شامل جامع مضامین اِن دونوں عیوب سے پاک ہیں۔ادب کے بنیادی مسائل پر روشنی:

ایک نقاد کا مقصود محض ادبی فن پاروں سے متعلق اپنی آراء پیش کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ادب کو ایک صحت مندانہ رویہ سے آشنا کرنا بھی اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔فیضؔ کی نظریں اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی تھیں۔ایک شاعر ہونے کے علاوہ ان کی حیثیت ایک مُدبّر اور دانشور کی بھی ہے۔اظہارِ بیان میں حُسن اور خوبی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مصنف کا ذہن خود ہر قسم کے شکوک وشبہات سے پاک ہوتا ہے۔جس قدر لکھنے والے کا نظریہ اس کے اپنے ذہن میں صاف اور واضح ہوگا وہ اُسی قدر آسانی سے اپنے قاری کو اپنے موقف آگاہی دے سکے گا۔نظریات میں عدم لرزش اور بیان میں سادگی نے فیضؔ کے تنقیدی مضامین کو پختہ کاری اور سلاست کا حسین امتزاج بنا دیا ہے۔ڈاکٹر

سید عبداللہ جیسے نقاد ایک جیّد اُستاد کہ حیثیت سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ ادب کے دقیق مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کو رہنما تصور کرتے ہیں:

> ''میں مدرس کے طور پر کہتا ہوں کہ میزان میری محسن کتابوں میں سے ہے کیوں کہ مشکل سے مشکل مسائل آسان ترین انداز میں حل کیے گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی تدریس میں اس سے بے حد فائدہ اُٹھایا۔''**(۳۵)**

فیضؔ کی تنقید کا مجموعہ ''میزان'' ادب سے متعلق بنیادی مسائل سے بحث کرتا ہے اور اس کی حیثیت اُردو تنقید کی مختصر تاریخ میں حالؔی کی مقدمۂ شعر و شاعری کی سی ہے جو ادب کی بیشتر اُلجھنوں سے متعلق مدلل گفتگو کے علاوہ انہیں سُلجھانے کی ایک شعوری کوشش بھی ہے۔ فیضؔ نے بھی ایک مخصوص زاویۂ فکر اپناتے ہوئے ادب سے متعلق اپنے نظریات اور اپنی آراء کو اَدب کی تطہر کے لیے لازمی سمجھا ہے۔ ادب کے موضوعات سے متعلق اِن کا نظریہ یہ ہے کہ ایک ترقی پسند ادیب تمام موضوعات پر قلم اُٹھا سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک قاری کے لیے دلچسپی کا باعث کون کون سے موضوعات ہو سکتے ہیں۔ وقت اور زمانے کی تبدیل نے عوام کے موضوعات میں جو تبدیلی رونما کی ہے اس کا ادراک اور شعور رکھنا بھی ادیب کی ذمہ داری اور فرائض میں شامل ہے۔ اپنے مضمون'' ادب کا ترقی پسند نظریہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک ترقی پسند ان اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے جن کے بیان اور تجزیے سے ترقی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی ہے۔ وہ ذاتی اور اجتماعی، بنیادی اور فروعی، اہم اور غیر اہم قسم کے تجربات کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان میں کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے ان کی اہمیت اور غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔''**(۳۶)**

اس سلسلے میں غزل کی مثال بھی پیشِ نظر رکھی جا سکتی ہے کہ جس کی تنگ دامنی کا شکوہ اکثر ناقدین کا موضوع رہا ہے۔ فرد اور سماج کے تعلق کے پیشِ نظر غزل کے اُسلوب و اظہار میں جو وسعت پنہاں ہے اس کا شعور نسلِ نو کے لیے بے حد ضروری تھا۔ مگر بدقسمتی نو جوان غزل گو اس کی جانب راغب نہ ہو سکے۔ اپنے اسلاف کی تقلید یا اِن سے فرار کے علاوہ کوئی راہ ان کو سُجھائی نہیں دیتی تھی۔ فیضؔ نے ادب کی اہم صنف کے بنیادی مسئلہ پر توجہ مرکوز کی اور ان دونوں رویوں کی تردید کی۔ ان کی نظر میں اُردو غزل کی روایت میں ان دونوں رویوں کا کوئی مقام نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی رائے میں جمود کی اس کیفیت اور امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لانے سے مفر کی جو صورت پیدا ہوئی اس نے اُردو غزل کے قاری کو اس دشت کی سیاحی سے محروم کر دیا:

''جدید دور میں اس افراط وتفریط کی صورت یہ ٹھہری کہ پہلے ایک گروہ کو شبہ ہوا کہ غزل تعیش پسند، پراگندہ خیال اور بے مقصد لوگوں کا مشغلہ ہے۔ جسے عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی تجربات کے اظہار میں کسی طور کام میں نہیں لایا جاسکتا۔ چنانچہ اس مکتبۂ فکر میں غزل قریب قریب حکماً مردود قرار پائی۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ بعض ہونہار لکھنے والے جن کی تربیت اور مزاج غزل ہی کے لیے موزوں تھا اپنے دل کی بات پوری طرح کُھل کر نہ کہہ سکے، پھر بالکل حال میں مخالف سَمت ہوا چلی تو بیشتر لوگ میرؔ، سوداؔ کے رنگ میں غزل کہنے لگے اور یہ محسوس ہونے لگا کہ اس تنگنائے سے ادھر کوئی میدان قابلِ اعتناء ہی نہیں۔ اس سے یہ خرابی ہوئی کہ پچھلے بیس تیس برس میں اُسلوب واظہار کے جو جو اہم تجربات مشاہدے میں آئے تھے آگے نہ بڑھ سکے اور ان کی امکانی صلاحیتوں کی مکمل سیاحی نہ ہوسکی۔''**(۳۷)**

فیضؔ کے مطابق اَدب کے فروغ کے لیے محض مشاہدہ ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ جدیدیت کے زُعم میں روایت سے کٹ کر شعر کہنے کی روایت فیضؔ کے نزدیک خوش آئند نہیں۔ وہ شاعری کو ایک موثّر ذریعۂ اظہار کے طور پر دیکھتے ہیں مگر اس میں انحطاط کا ذمہ داران عوامل کو قرار دیتے ہیں جو شعر کی شعریت کو کم کرنے کے درپے ہیں۔ فیضؔ کی رائے میں شعر کی افادیت نہ صرف اس کے ابلاغ میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اس سے شعر کی جمالیات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں اُنھوں نے سلمان اطہر جاوید کو بتایا:

''عصر حاضر میں اُردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، چوں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس لیے شعر کو پہچاننا ہی دشوار ہو چکا ہے کہ یہ شعر ہے۔ جدید شاعری میں ابلاغ کی کمی ہے، جس کے باعث نفسیاتی طور پر شعر کا ردِّعمل ہی پیدا نہیں ہوتا اور شعر، شعریت اور تاثیر سے عاری ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر شعر میں تاثیر ہو تو نہ صرف سمجھ میں آتا ہے بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔''**(۳۸)**

ادب کے عمیق مطالعے کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرے کے خدوخال اور اس میں موجود افراد کے مسائل سے واقفیت کی بنا پر فیضؔ کی تحریریں محض یک رُخی نہیں۔ ان کی تحریر کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے اس کا بار بار مطالعہ ہماری زندگی میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اَدب کیونکہ زندگی کا عکس ہے لہٰذا اس کی مدد سے اپنے کل کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ آئینۂ ایاّم میں اپنے خدوخال کا جائزہ بہتر طور پر لے سکتے ہیں۔ ہمارا یہ تجزیہ ہماری سماجی زندگی کو نئی دلکشی بخش دے گا۔ فیضؔ کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''میزان'' پر تبصرے کے دوران جمال نقوی کہتے ہیں:

''اس کے بعد کے مضمون 'شاعر کی قدریں' میں انہوں نے جمالیاتی قدروں کی بات کی

ہے جس سے ہماری سماجی زندگی میں ایک خوش گوار باب کا اضافہ ہوتا ہے۔''**(۳۹)**

فیضؔ کی تنقید کی یہ خوبی بھی قابلِ ستائش ہے کہ اس میں موجود مواد اَدب کے بے شمار طالبِ علموں کی علمی پیاس کو بجھا کر ان کی تشفی اور تسلّی کرتا رہا ہے۔ اِن طالبِ علموں کے نظریات خواہ ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں مگر وہ اِس سے ضرور فیضؔ یاب ہوتے رہے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اہلِ قلم نے اس کتاب کو ادب کے بنیادی مسائل کے حل کا سرچشمہ جانا اور ۱۹۳۶ء کے بعد ادب سے متعلق رویوں میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کا سہرا بلا شبہ فیضؔ کی تنقید کو جاتا ہے:

> ''میزان بنیادی طور پر ترقی پسند نظریے کی نمائندگی کرتی ہے مگر یہ قابلِ توجہ امر ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ادب کے اکثر بنیادی مسائل کی بحث موجود ہے جن پر ۱۹۳۶ء کے بعد اہلِ قلم نے خاص توجہ صرف کی۔''**(۴۰)**

فیضؔ کی ادبی زندگی پچاس سال سے زائد کے عرصے پر محیط ہے۔جس طرح بحیثیت شاعر ان کا کلام کمیت کے اعتبار سے بہت کم ہے، اِسی طرح بطور نقاد اِن کا کام کچھ زیادہ نہیں۔''میزان'' میں اِن کے تحریر کردہ مضامین کی تعداد صرف ۳۱ ہے۔ یہ درست ہے کہ فیضؔ نے مقدار کے مقابلے میں معیار کو اہمیت دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا کام فکری ریاضت کا نچوڑ ہے۔روایتی تنقید کی بجائے فیضؔ نے امکانات کے سرے اُبھارنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے انہیں ایک گہری سوچ اور سنجیدگی درکار تھی:

> ''ان مضامین کو اُنھوں نے مختلف اوقات میں لکھا تھا جو کہ کم وبیش ایک چوتھائی صدی پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین بہت سوچ سمجھ کر اور سنجیدگی سے لکھے گئے ہیں۔''**(۴۱)**

اپنی فکر انگیز تنقید میں فیضؔ نے اَدب کا شعوری مقصد سے رابطہ استوار کر دیا ہے۔ان کی تمام شاعری بھی اِسی پر دلالت کرتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اگر فیضؔ کے مدلل مقالات کو اَدب کی تاریخ کے حوالے سے پرکھا جائے تو قاری کو بہت سے سوالات کے جوابات ملتے ہیں اور بہت سے نئے سوالات اس کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔انہوں نے فن سے متعلق نظریاتی مباحث کے علاوہ متقدمین اور معاصرین کے متعلق آراء بھی پیش کیں ہیں جو اَدب کو ایک نئی سَمت دینے کی کوشش ہے۔اشفاق حسین نے فیضؔ کی تنقید پر سلیم اختر کی دی گئیں آراء سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فیضؔ کی تنقید قاری کی سوچ اور فکر کو فعال بنانے میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں:

> ''کسی بھی شاعر کے نظریۂ ادب کو اگر اس کے نثری تناظر میں دیکھا جائے تو پھر کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنا لازمی ہو جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ فیضؔ صاحب کے اِن لکھے ہوئے مضامین کی روشنی میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے

فیضؔ کے لکھے ہوئے تمام مقالوں کو ان کے اپنے تاریخی تناظر میں دیکھا ہے اور نتیجہ نکالا ہے کہ یہ، مضامین آج بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور اِن مضامین کے مطالعہ سے آج بھی فکر کو مہمیز ملتی ہے۔'' (۴۲)

فیضؔ نے اپنی تنقید کو با قاعدہ تنقید نہیں کہا بلکہ اپنے قاری کے ساتھ افہام و تفہیم کا رشتہ جوڑنے کی ایک سعی خیال کیا ہے۔ وہ دورانِ تحریر بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت سی باتیں قاری کے سمجھنے کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اُن کی فکر صرف اُردو اَدب تک محدود نہ تھی بلکہ وہ عالمی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے بھی اہلِ قلم کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سحر انصاری کی رائے میں میزان نے فکر و نظر کے کئی راستے کھول دیے ہیں:

''اِن کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے برِصغیر کے مخصوص حوالے کے ساتھ بین الاقوامی اور عالمی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں اُنہوں نے صرف بعض بنیادی سوالات کے جوابات دیے بلکہ خود بہت سے سوال اُٹھا کر قاری اور اہلِ قلم کو سوچنے کی طرف مائل کیا ہے۔'' (۴۳)

اپنی تمام اعتدال پسندی کے باوجود بھی تنقید کے شعبے میں کہیں کہیں عدم توازن کا شکار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے استدلال کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ مضر اور مفید پروپیگنڈہ جیسی اصطلاحات کا سہارا لینے کی کوشش بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا لہجہ واشگاف ہونے کے ساتھ ساتھ تند و تیز بھی ہو جاتا ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کی وکالت کرتے ہوئے صرف ترقی پسند ادب کو ہی تمام ادب کے مدِ مقابل لا کھڑا کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ پروپیگنڈے کو قطعیت کے ساتھ ادب کے لیے طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں:

''کیا ادب کا مقصد پروپیگنڈا ہے؟ جی ہاں، قطعی! ادب کا کوئی نمونہ آپ سے کوئی تجربہ، کوئی نظریہ، کوئی حقیقت منوا لیتا (ایک لمحے کے لیے ہی سہی) وہ بحیثیت ادب کے خاک بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ادیب نے کچھ دیکھا ہے، کچھ محسوس کیا ہے، کچھ سوچا ہے، وہ کوشش کرتا ہے آپ بھی وہی کچھ دیکھیں، وہی کچھ محسوس کریں، وہی کچھ سوچیں۔ اگر یہ پروپیگنڈا نہیں ہے تو پروپیگنڈا اور کسے کہتے ہیں؟ ترقی پسند ادب اور دوسری قسم کے ادب میں یہ فرق نہیں ہے کہ یہ پروپیگنڈا کرتا ہے اور وہ نہیں کرتا فرق صرف یہ ہے کہ ایک پروپیگنڈا صحیح اور مفید ہے اور دوسرا گمراہ کن اور مضر یا غیر مفید۔'' تو کیا ادب اور پروپیگنڈا میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (۴۴)

فیضؔ کا عہد ایک ہنگامہ خیز عہد تھا اور اس دور میں فیضؔ نے خود بھی ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ ترقی پسند شاعر ہونے کے ناطے وہ مشاہدے اور مجاہدے کے عمل سے گزرتے ہوئے ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ

تھیں۔انہوں نے گا ہے گا ہے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ وہ فرصت جو انہیں جم کر تنقید کے لئے چاہیے تھی وہ میسر نہ آسکی اور اپنے مضامین پر نظرِ ثانی بھی ممکن نہ ہوسکی، لہٰذا تنقید کے میدان میں ان سے بعض فیصلے درست نہ ہو سکے۔

''فیضؔ بعض تنقیدی فیصلے عجلت میں بھی کرتے ہیں۔کسی صنفِ ادب کی مقبولیت سے متاثر ہوکر وہ دوسری صنف کی تسلیم شدہ اہمیت کے بارے میں متذبذب ہوجاتے ہیں۔''(۴۵)

سید عبداللہ نے ان کی تنقید کو خاصہ سراہا ہے مگر ان کے بہت سے دلائل سے نا اتفاقی کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔فیضؔ نے تاریخ کو نظریے کی عینک لگا کر دیکھا ہے جس کے باعث وہ ہمیشہ مخصوص نتائج پر پہنچتے ہیں۔سید عبداللہ کی رائے میں ہماری کلچر کی بنیاد میں دینی عقائد کو خارج از بحث سمجھ لینا درست نہیں۔

''فیضؔ نے پاکستانی تہذیب کے موضوع پر کئی مضامین میں اظہارِ خیال کیا ہے۔یہ ان کا محبوب موضوع ہے اور اتفاق یہ کہ راقم الحروف کو بھی اس مسئلے سے خاص دلچسپی ہے۔مگر اسے سوءِ اتفاق سمجھئے کہ اس بارے میں فیضؔ کے استدلال سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔وجہ یہ کہ موصوف کے نزدیک کلچر کا سارا مسئلہ از سرتا پا زمینی، خارجی اور قدرے اقتصادی اور سماجی ہے۔میں بھی کلچر کی ان بنیادوں کو تسلیم کرتا ہوں لیکن پاکستانی کلچر سے اسلامی عقیدوں (مسلمانی عنصر) کو خارج نہیں سمجھ سکتا۔''(۴۶)

فیضؔ نے ادب کو ایک سماجی عمل سے تعبیر کیا ہے اور اس کے محرکات کو قطعی طور پر خارجی قرار دیا ہے۔اس کے برعکس ادب کے بیشتر ناقدین ادب کو روحانی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ادب کی تاریخ کو اس طور سے سمجھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے سید عبداللہ نے اپنے مضمون بعنوان ''میزان پر ایک نظر'' میں فیضؔ کے نقطۂ نظر سے بس اس قدر اختلاف کیا ہے کہ وہ فیضؔ کے موقف کو نصف سچائی سمجھتے ہوئے اس میں تخلیق کار کے ذاتی اور انفرادی خصائص کو بھی ایک کلیدی محرک قرار دیتے ہیں۔یہ حصائص جو موجب تخلیق بھی ہیں اور ادب کے روحانی عمل ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔تاہم اِن کے نزدیک اس میں کچھ پیچیدگیاں ضرور ہیں جن کا تجزیہ کرنا قبل از وقت ہوگا:

''پوری سچائی یہ ہے کہ ادب ایک روحانی عمل بھی ہے۔اس کی تخلیق میں فرد کے خصائص ذاتی اور اس کی منفرد اور داخلی زندگی بھی پورا حصہ لیتی ہے۔اس میں وہ فیضان بھی کارفرما ہوتا ہے جس کا صحیح تجزیہ ابھی ممکن نہیں ہوا۔''(۴۷)

فیضؔ ایک نظریاتی انسان تھے اور باقاعدہ نقاد کے طور پر اِنہیں مطلوبہ یکسوئی حاصل نہ ہوسکی تاہم وہ اپنے اِن نظریات کی ترویج کی تگ ودو میں لگے رہے۔اِس کوشش میں فیضؔ نے وقتاً فوقتاً رسائل اور اخبارات میں تبصرے اور کالم بھی تحریر کیے۔اس کے علاوہ ان کی صحافیانہ شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اس صورت میں ان کے

ذاتی تاثرات نے انخلاء کے لیے تنقید کا سہارا لیا۔ ہر چند کہ فیضؔ کی تنقید میں اعتدال و توازن کی صورت جلوہ گر رہی لیکن یہ نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک میں شمولیت نے ان کی ''خود ضبطی'' کو بھی کسی قدر متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ ناقدین سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی تنقید کا منطقی رُخ ایک خاص مقصد کی طرف موڑنے کی جستجو اِن پر غالب ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا بر وقت احساس فیضؔ کو پروپیگنڈہ کی سطح سے بچائے رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ مگر اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے وسیلۂ اظہار کے حُسن و قباء سے پہلو تہی کر کے نظریۂ ضرورت کے تحت ادب تخلیق کرنے کی حمایت کرنا اور نظریاتی لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانا فیضؔ کی دانش مندی تصور نہیں کی جا سکتی۔ فیضؔ کے اس تنقیدی رویے پر تنقید کرتے ہوئے مظہر امام لکھتے ہیں:

> ''مثلاً وہ بڑی بے تکلفی سے دوسرے ترقی پسند ناقدین کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ ادب بھی ایک طرح کا پروپیگنڈا ہی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس کمزور لمحے کے بعد جب فیضؔ کی ''خود ضبطی'' لوٹ آئی ہوگی تو اُنہیں اپنے بیان کی بے وقعتی کا احساس ہوا ہوگا۔ دراصل جب ہم پہلے سے موضوعات طے کر لیتے ہیں اور طے شدہ موضوعات کے اظہار کو اپنے ادب کا مقصد قرار دے لیتے ہیں تو ادب محض اظہار یا ترجمانی نہیں رہتا، پروپیگنڈا بن جاتا ہے اور پروپیگنڈے کے لیے ذرائع اظہار اچھے بُرے، سچے جھوٹے سب ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہاں نظر مقصد پر ہوتی ہے۔ ادب صرف مقصد پر نظر رکھے تو ادب نہیں رہتا۔ وہ وسیلۂ اظہار کے حُسن اور صداقت سے صرفِ نظر کر ہی نہیں سکتا۔'' (۴۸)

اس قسم کے تنقیدی رجحان نے جہاں فیضؔ کو نقصان پہنچایا ہے وہاں تنقیدی فکر کو بھی متاثر کیا ہے۔ جمیل جالبی نے واضح طور پر تنقید کے دو رجحانات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلا رجحان یونیورسٹیوں اور ان میں رائج تعلیم کے فروغ سے نمو پاتا ہے جبکہ دوسرا رجحان ذرائع ابلاغ کے بل پر اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس رجحان میں ذاتی اور تاثراتی تنقید کے دور رس نتائج سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا:

> ''دوسری قسم کی تنقید ذاتی یا تاثراتی ہے۔ اس میں نقاد کسی ادب پارہ کے بارے میں ذاتی تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں کے تبصرے، مختلف ادبی کالم اس قسم کی تنقید سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ تنقید کا صحافیانہ استعمال ہے۔ اس قسم کی تنقید نے غلط رجحانات کو پروان چڑھایا ہے اور فکر کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔'' (۴۹)

شاعری کے میدان میں جو شہرت فیضؔ کے حصے میں آئی وہ اِنہیں بحیثیت نقاد انہیں میسر نہ آسکی۔ تاہم فیضؔ کی ہر دل عزیز شخصیت نے عام قاری پر بھی تنقید کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اس کے علاوہ فکر و خیال کی نئی

راہوں پر چلتے ہوئے فیضؔ نے تنقید میں امکانات کے نئے سرے اُبھارنے کی آرزو بھی کی ہے۔ فیضؔ کا اُسلوب شاعرانہ نہیں بلکہ خالص نثر کا اُسلوب ہے۔ مزید یہ کہ ترقی پسندی نے ان کے اُسلوب کو ایک اصلاحی اُسلوب بنا حالیؔ کے مقدمۂ شعر وشاعری کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ براہِ راست گفتگو اور بے ساختگی نے ان کی تنقید کو مجلسی تنقید بنا دیا ہے۔ ایک موثر نقاد کا انداز لیے فیضؔ ایک سنجیدہ اور دوٹوک موقف اختیار کرتے ہیں۔ گول مول اور مبہم بات کرنا ان کا مسلک نہیں۔ ایک علمی شخصیت ہونے کے حوالے سے ان کی تنقید متانت اور استدلال سے عبارت ہے۔ ان کی آراء غیر متزلزل اور غیر متغیر اُصولوں پر مبنی ہیں۔ ابلاغ کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اجتماعیت اور افادیت کو اَدب کے حق میں بہتر تصور کرتے ہیں اور جمہور سے ادب کا رشتہ مضبوط کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند نظریات کی روشنی میں فیضؔ نے اِس بات پر زور دیا کہ فنونِ لطیفہ اور حُسن و جمالیات کی جڑیں معاشرے سے ہی پھوٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا جمہور کے ساتھ رابطہ ہر دور میں قائم رہا ہے۔ تنقید میں اُنھوں نے اَدب کے ترقی پسند نظریاتی مسائل کو چھیڑا ہے اور ادب کو دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح ثقافت یا کلچر کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اِن کی رائے میں عمرانی حقائق کا بیان نہ صرف اَدب میں افادیت کا پیش خیمہ ہے بلکہ ادب میں جمالیات بھی انہیں حقیقتوں کا ثمر ہوا کرتی ہے۔ تنقید کے میدان میں عوام اور اِن کے مسائل سے وابستہ موضوعات اِن کے محبوب ترین موضوعات ہیں لہٰذا فیضؔ کی تنقید اور تخلیق ایک ہی ڈگر پر گامزن نظر آتی ہیں۔ سادگی، سلاست اور پختہ کاری کے علاوہ ان مضامین کی موزوں طوالت اعتدال اور توازن کی عمدہ مثل پیش کرتے ہیں۔ فیضؔ کی رائے میں شعر کی افادیت نہ صرف اس کے ابلاغ میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اس سے شعر کی جمالیات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جدیدیت کے زُعم میں روایت سے کٹ کر شعر کہنے کی روایت فیضؔ کے نزدیک خوش آئند نہیں۔۔ تاہم فیضؔ نے تاریخ کو نظریے کی عینک لگا کر دیکھا ہے جس کے باعث وہ ہمیشہ مخصوص نتائج پر پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادب کو محض ایک سماجی عمل قرار دے کر اِسے داخلیت کے فیضان سے دور رکھنا ادب کو گہرائی اور گیرائی سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فیضؔ کی تنقید قاری کی سوچ اور فکر کو فعال بنانے میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ اُن کی فکر صرف اُردو اَدب تک محدود نہ تھی بلکہ وہ عالمی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے بھی اہلِ قلم کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں فیضؔ کے منفرد تنقیدی اُسلوب کو عام کیا جائے تا کہ ادب اور معاشرے میں اجتماعی شعور کو فروغ دیا جا سکے۔

حواشی

ا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟''، مشمولہ ''اُردو تنقید (انتخاب مقالات)''، مرتبہ اشتیاق احمد، عرفان

افضل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۳
۲۔ احتشام حسین، ڈاکٹر، ''اُردو اَدب کی تنقیدی تاریخ''، آصف یٰسین پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱۹
۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء، ص ۸۷
۴۔ ایضاً، ص ۱ ۵۔ ایضاً، ص ۵۴ ۶۔ ایضاً، ص ۷۷ ۷۔ ایضاً، ص ۶۴
۸۔ ایضاً، ص ۶۷ ۹۔ ایضاً، ص ۵۰۲ ۱۰۔ ایضاً، ص ۶۶
۱۱۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، چمن بُک ڈپو، دہلی، س ن، ص ۱۶۶۔۱۶۷
۱۲۔ سید محمد عقیل، 'فیضؔ صاحب کا نظریہ شاعری اور اس کی تطبیق'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، دی ریکونز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۰
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۹۷
۱۴۔ اشفاق سلیم مرزا، 'فیضؔ کے شعری و ادبی میلانات'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، دی ریکونز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۶۷۱
۱۵۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، کوہِ نور آرٹ پریس، کلکتہ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲
۱۶۔ صلاح الدین حیدر، 'میزان: ایک مطالعہ'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، دی ریکونز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۶۶۴
۱۷۔ سحر انصاری، ڈاکٹر، 'فیضؔ: ایک نثر نگار'، مشمولہ ماہِ نو (بیادِ فیضؔ)، ادارہ مطبوعاتِ پاکستان، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۵۷
۱۹۔ صلاح الدین حیدر، 'میزان: ایک مطالعہ'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۶۶۶
۲۰۔ مظہر امام، 'فیضؔ کی تنقیدیں'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۰۱۰
۲۱۔ صادق نقوی، 'تاریخ اور ادب کا باہمی ربط'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۰۰۷
۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، ص ۴۴۸
۲۳۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، ص ۱۳۲
۲۴۔ ایضاً، ص ۳۴
۲۵۔ ایضاً، ص ۴۰
۲۶۔ سحر انصاری، ڈاکٹر، 'فیضؔ: ایک نثر نگار'، مشمولہ ماہِ نو (بیادِ فیضؔ)، ص ۵۷
۲۷۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، 'ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید'، مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''، مُرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، لندن، ۱۹۸۷ء، ص ۵۵۰
۲۸۔ مظہر امام، 'فیضؔ کی تنقیدیں'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۰۰۷
۲۹۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، 'مارکسی تنقید، رجحان اور رویے'، مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' مُرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ص ۵۷۲
۳۰۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، 'ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید'، مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''، مُرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ص ۵۵۳

۳۱۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، ص ۱۷
۳۲۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، 'مارکسی تنقید، رجحان اور رویے'، مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' مُرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ص ۵۶۹
۳۳۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، 'ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید'، مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''، مُرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ص ۵۵۳
۳۴۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، ص ۲۴۲
۳۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، 'میزان پر ایک نظر'، مشمولہ فنون، شمارہ نمبر ۳۔۴، خاص شمارہ ۱۰، لاہور، ۴۷۔انار کلی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۸
۳۶۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، ص ۲۳
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۳۸۔ سلمان اطہر جاوید، ڈاکٹر، 'فیضؔ اور جدیدیت'، مشمولہ ''فیضؔ فہمی''، ص ۴۶۱
۳۹۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، ''فیضؔ کا فکری ابلاغ''، ماس پرنٹرز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۶۰
۴۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، 'میزان پر ایک نظر'، مشمولہ فنون، ص ۶۹
۴۱۔ اشفاق حسین، 'میزان': ایک مطالعہ، مشمولہ ''فیضؔ: تنقید کی میزان پر''، ماس پرنٹر، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۷۶
۴۲۔ اشفاق حسین، 'فیضؔ کا تصورِ ادب 'میزان' کی روشنی میں'، مشمولہ ''فیضؔ: تنقید کی میزان پر''، ص ۶۸
۴۳۔ سحر انصاری، ڈاکٹر، 'فیضؔ: ایک نثر نگار'، مشمولہ ماہِ نو (بیادِ فیضؔ)، ص ۵۹
۴۴۔ فیض احمد فیضؔ، ''میزان''، ص ۲۱۔۲۲
۴۵۔ مظہر امام، 'فیضؔ کی تنقیدیں'، مشمولہ، ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۰۰۹
۴۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، 'میزان پر ایک نظر'، مشمولہ فنون، ص ۷۲
۴۷۔ ایضاً، ص ۶۹
۴۸۔ مظہر امام، 'فیضؔ کی تنقیدیں'، مشمولہ، ''فیضؔ فہمی''، ص ۱۰۰۸
۴۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، ص ۸۷